ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ساقی ارباب ذوق
A Pdf Book Company

مرگِ صدا

(غزلیں)

مجید امجد

مرتبہ

محمد امین

کاروانِ ادب ملتان صدر

جملہ حقوق محفوظ

بار اول ———— ۱۹۸۲ء

مطبع ———— منظور پریس لاہور

ناشر ———— کاروانِ ادب ملتان صدر

قیمت : ۱۵/۰ روپے

اِنتساب

سیمیں ایلن

کے

نام

حرفِ اظہار

مجید امجد نظم کا عظیم شاعر ہے، جتنا عظیم وہ نظم گو ہے اتنا ہی عظیم وہ غزل گو بھی ہے، ناقدین نے اُن کی غزل کو فراموش کیا ہے، ان کی مطبوعہ غزلوں کی تعداد ساٹھ کے قریب ہے۔ جو غزلوں کا اچھا خاصا مجموعہ بن جاتا ہے ان غزلوں کے انتخاب سے میرا مقصد مجید امجد کی اردو غزل میں کنٹری بیوشن کو متعین کرنا ہے،

مجید امجد کی ہر غزل میں تمام روایتی، فنی اور اظہاری خوبیاں موجود ہیں، ندرتِ خیال اور جدتِ اظہار میں ان کا اندازِ نظم کی طرح منفرد ہے، غزل میں بھی ان کا آہنگ اور لہجہ منفرد ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں نظمیت کا عنصر غالب ہے، نظم کی طرح مجید امجد نے غزل میں بھی موضوعاتی اور ہیئتی تجربے کئے ہیں، چند عروضی تجربے ملاحظہ کیجئے،

ایک ایک جھروکا خندہ بلب ایک ایک گلی کہرام :: ہم لب سے لگا کر جام ہوئے بدنام بڑے بدنام

اس غزل میں ارکان کی ترتیب کچھ اس طرح ہے

"فعلن فِعلن فعلن فِعلن فعلن فِعلن فعلان" ارکان کی اس ترتیب نے

اس میں موسیقی اور آہنگ کا ایک نیا تاثر پیدا کر دیا ہے،

"اپنے دل کی چٹان سے پوچھو ریزہ اک کنکری کا کتنا بوجھل ہے" والی

غزل میں ارکان کی تعداد ہر مصرعے میں دس ہے یعنی

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع

"جاوداں قدروں کی شمعیں بجھ گئیں تو جل اٹھی تقدیر دل" والی غزل کے

ارکان پانچ ہیں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

دیگر ہیئتی تجربوں کے لئے کون دیکھے گا "تیرے دل کے لئے ۔ صبحوں کی

وادیوں میں گلوں کے پڑاؤ تھے۔ عمروں کے اس معمورے میں، ہے کوئی ایسا دن بھی جو

والی غزلیں غور سے مطالعہ کیجئے،

انتخاب جتنا بھی معروضی کیوں نہ ہو، موضوعی ہی رہتا ہے بہر حال میں نے

کوشش کی ہے، کہ اس انتخاب سے مجید امجد کی غزل کے خدوخال اجاگر ہو سکیں،

اردو غزل میں ان کے لہجے کی پہچان ہو سکے اور غزل میں بھی ان کے مقام کا تعین کیا جا سکے

"شب رفتہ" "مرے خدا مرے دل" "شب رفتہ کے بعد" اور "ان گنت سورج"

سے انتخاب کیا گیا ہے، اور چند غزلیں اپنی بیاض سے نقل کی گئی ہیں۔ تین غزلیں "شب

رفتہ کے بعد" میں "کون دیکھے گا"، "جہاں نورد" اور "بول انمول" کے عنوانات سے

نظموں میں شامل ہیں، "مرے خدا مرے دل" میں انہیں غزلوں کے روپ میں چھاپا گیا ہے، میں نے مجید امجد سے انہیں غزلوں کے نام ہی سے سنا ہے اور میری بیاض میں یہ غزلوں کی صورت میں درج ہیں۔ اس لئے میں نے انہیں غزلوں میں شامل کیا ہے، مجید امجد کا یہ معمول تھا کہ وہ غزلوں، نظموں اور شعروں کو بدلتے رہتے تھے، اور ان کی کسی ایک صورت سے مطمئن نہیں ہوتے تھے، اس لئے بعض مصرعوں کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔

میں انور جمال کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے مجید امجد کی ایک غزل عنایت کی جو اس مجموعے میں شامل ہے،

محمد امین

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

یہ دنیا راستہ ہے ہم مُسافر
شکستہ پا، شکستہ دم مُسافر

عجب کچھ زندگانی کا سفر ہے
مُسافر کا نہیں محرم مُسافر

ابد اک موڑ تیرے راستے کی
تو سیلِ شوق ہے مت تھم مُسافر

کٹھن ہے عشق کی منزل کٹھن ہے
چلے ہیں اس رَوِش پر کم مُسافر

نوکِ قلم سے حرفِ تمنّا ٹپک پڑا،
اَب کون خط لکھے مرے خط کے جواب میں

اک زلّہ گیر مائدۂ لطف میں بھی ہوں
مجھ کو بھی اک کباب بھگو کر شراب میں

ہو کے اس چشمِ مے پرست سے مست
کیا الجھتا ہے آج مست سے مست

ایک ہی لغزش ، اور گذر بھی گئے ما
عقل کے ہر بلند و پست سے مست

کون نظروں میں اب سمائے کہ ہم
ہیں تری چشمِ مست مست سے مست

اس گلستاں میں پینے آئے ہیں
ہر گلِ ساتگیں بدست سے مست

سب ہیں آغوشِ ہوش میں امجد
ایک میں ہوں دمِ الست سے مست

کیا روپ دوستی کا ، کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا

اک تنکا آشیانہ ، اک راگنی اثاثہ
اک موسمِ بہاراں ، مہمان دو گھڑی کا

آخر کوئی کنارا ، اس سیلِ بے کراں کا
آخر کوئی مداوا ، اس دردِ زندگی کا

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی افق پر تارا سا روشنی کا

شاید اِدھر سے گزرے پھر بھی ترا سفینہ
بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا

اس التفات پر ہوں لاکھ التفات قرباں
مجھ سے کبھی نہ پھیرا رُخ تو نے بے رُخی کا

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا

او مسکراتے تارو، او کھلکھلاتے پھولو
کوئی علاج میری آشفتہ خاطری کا

میں تڑپا کیا اور گیسوئے ناز
سنورتے گئے، دن گزرتے گئے

میں روتا رہا اور بہاروں کے رنگ
بکھرتے گئے، دن گزرتے گئے

مری زیست پر ان کے جلووں کے نقش
ابھرتے گئے، دن گزرتے گئے

چھلکتے ہوئے جام میں ماہ وسال
اترتے گئے، دن گزرتے گئے

دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا تنہا،

ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گزرا ہے بارہا، تنہا

تیری آہٹ قدم قدم، اور میں
اس معیت میں بھی رہا، تنہا،

کہنہ یادوں کے برف زاروں سے
ایک آنسو بہا، بہا تنہا،

ڈوبتے ساحلوں کے موڑ پہ دل
اک کھنڈر سا رہا سہما، تنہا

گونجتا رہ گیا خلاؤں میں،
وقت کا ایک قہقہہ، تنہا

ایک ایک جھروکا خندہ بلب، ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام ہوئے، بدنام بڑھے بدنام

رُت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں، اُف یاد کسی کی یاد
پھر سیلِ زماں میں تیر گیا اک نام کسی کا نام

دل ہے کہ اک اجنبیٔ حیراں، تم ہو کہ پرایا دیس
نظروں کی کہانی بن نہ سکیں ہونٹوں پہ رکے پیغام

روندیں تو یہ کلیاں، نیشِ بلا! چومیں تو یہ شعلے پھول
یہ غم یہ کسی کی دین بھی ہے، انعام عجب انعام

اے تیرگیوں کی گھومتی رو، کوئی تو رسیلی صبح
اے روشنیوں کی ڈولتی لو، اک شام نشیلی شام

رہ رہ کے جیالے راہیوں کو دیتا ہے یہ کون آواز
کون کی ہنستی منڈیروں پر، تم ہو کہ غمِ ایّام

بے برگ شجر گردوں کی طرف، پھیلائیں ہمکتے ہات
پھولوں سے بھری ڈھلوان پہ سوکھے پات کریں بسرام

ہم فکر میں ہیں اس عالم کا دستور ہے کیا دستور
یہ کس کو خبر، اس فکر کا ہے دستورِ دو عالم نام

مہکتے، میٹھے، مستانے زمانے
کب آئیں گے وُہ من مانے زمانے

جو میرے کُنجِ دل میں گونجتے ہیں
نہیں دیکھے وہ دُنیا نے، زمانے

تری پلکوں کی جنبش سے جو ٹپکا
اُسی اک پل کے افسانے، زمانے

تری سانسوں کی سوغاتیں، بہاریں
تری نظروں کے نذرانے، زمانے

کبھی تو میری دُنیا سے بھی گزرو
لئے آنکھوں میں انجانے زمانے

انہی کی زندگی، جو چل پڑے ہیں،
تری موجوں سے ٹکرانے، زمانے

میں فکرِ رازِ ہستی کا پرستار
مری تسبیح کے دانے، زمانے

ترے فرقِ ناز پہ تاج ہے مرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تری داستاں بھی عظیم ہے، مری داستاں بھی عظیم ہے

مری کتنی سوچتی صبحوں کو یہ خیال زہر پلا گیا
کسی تپتے لمحے کی آہ ہے، کہ خرامِ موجِ نسیم ہے

تہِ خاک، کرمکِ دانہ جو بھی شریکِ رقصِ حیات ہے
نہ بس ایک جلوۂ طور ہے، نہ بس ایک شوقِ کلیم ہے

یہ ہر ایک سمت مسافتوں میں گندھی پڑی ہیں جو ساعتیں
تری زندگی، مری زندگی، انہی موسموں کی شمیم ہے

کہیں محملوں کا غبار اڑے، کہیں منزلوں کے دیئے جلیں
خمِ آسماں، رہِ کارواں۔ نہ مقام ہے نہ مقیم ہے

حرم اور دیر فسانہ ہے، یہی جلتی سانس زمانہ ہے
یہی گوشۂ دلِ ناصبور ہی کنجِ باغِ نعیم ہے

دل سے ہر گزری بات گزری ہے
کس قیامت کی رات گزری ہے

چاندنی۔ نیم وا دریچہ۔ سکوت
آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

ہائے وہ لوگ، خوبصورت لوگ
جن کی دھن میں حیات گزری ہے

تمتماتا ہے، چہرۂ ایام
دل پہ کیا واردات گزری ہے،

کسی بھٹکے ہوئے خیال کی موج
کتنی یادوں کے ساتھ گزری ہے

پھر کوئی آس لڑکھڑائی ہے
کہ نسیمِ حیات گزری ہے،

بجھتے جاتے ہیں دکھتی پلکوں پہ دیپ
نیند آئی ہے، رات گزری ہے

روش روش پہ ہے نکہت فشاں، گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول، ارغواں گلاب کے پھول،
افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے،
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں، گلاب کے پھول
کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے،
عروسِ گل پہ قبائے جہاں، گلاب کے پھول
جہانِ گریۂ شبنم سے کس غرور کے ساتھ
گزر رہے ہیں، تبسم کناں گلاب کے پھول
یہ میرا دامنِ صد چاک، یہ ردائے بہار،
یہاں شراب کے چھینٹے، وہاں گلاب کے پھول

خیالِ یار، ترے سلسلے، نشوں کی رُتیں
جمالِ یار، تری جھلکیاں، گلاب کے پھول

مری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر، دلوں کا دُھواں گلاب کے پھول

سلگتے جاتے ہیں، چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں، گلاب کے پھول

یہ کیا طلسم ہے، یہ کس کی یاسمیں باہیں
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں گلاب کے پھول

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول،

قریبِ دل، خروشِ صد جہاں ہم

جو تم سُن لو تمہاری داستاں ہم

کسی کو چاہنے کی چاہ میں گم

جئے بن کر نگاہِ تشنگاں ہم

ہر اک ٹھوکر کی زد میں لاکھ منزل

ہمیں ڈھونڈو، نصیب گمرہاں ہم

ہمیں سمجھو، نگاہِ ناز والو!

لبوں پر کانپتا حرفِ بیاں ہم

کبھی سمتوں کی اس نگری میں امجدؔ

ابھرتے آفتابوں کی کماں ہم

قاصدِ مست گام ، موجِ صبا
کوئی رمزِ خرام ، موجِ صبا

وادیٔ برف کا کوئی سندیس
میرے اشکوں کے نام، موجِ صبا

کوئی موجِ خیال میں بہتی
منزلوں کا پیام ، موجِ صبا

سو سمٹتی مسافتوں کا طلسم
تیری کروٹ کے نام ، موجِ صبا ،

تیرے دامن کی خوشبوؤں میں گم

سو سہانے مقام ، موجِ صبا

آتی پت جھڑ کے ساتھ لوٹتے وقت

اک بہاریں پیام ، موجِ صبا

اک نوید نگاہ ، ایک حبیب

اک جوابِ سلام ، موجِ صبا ،

صدیوں سے راہ تکتی ہوئی وادیوں میں تم
اک لمحہ آ کے ہنس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا

ان وادیوں میں برف کے چھینٹوں کے ساتھ ساتھ
ہر سو شرر برس گئے میں ڈھونڈتا پھرا

راتیں ترائیوں کی تہوں میں لڑھک گئیں،
دا،، ،لدلوں میں دھنس گئے میں ڈھونڈتا پھرا

راہیں دھوئیں سے بھر گئیں میں منتظر رہا
قرنوں کے رُخ جھلس گئے میں ڈھونڈتا پھرا

تم پھر نہ آ سکو گے، بتانا تو تھا مجھے
تم دُور جا کے بس گئے میں ڈھونڈتا پھرا

برس گیا بہ خراباتِ آرزو ، ترا غم
قدح قدح تری یادیں سبو سبو ، ترا غم

ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں کو بہ کو ، ترا غم

غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن ، تری دھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبِ جو ، ترا غم

ندی پہ چاند کا پرتو ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص ، تو ، ترا غم

ہے جس کی رویں شگوفے، وہ فصل تیرا دھیان
ہے جس کے لمس میں ٹھنڈک وہ گرم لو، ترا غم

نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نے بلب تری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جو، ترا غم

طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیٔ شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم

نگہ اُٹھی تو زمانے کے سامنے، ترا رُوپ
پلک جھکی تو مرے دل کے روبرو، ترا غم

چہرہ اداس اداس تھا ، میلا لباس تھا
کیا دن تھے جب خیالِ تمنّا لباس تھا

عریاں ، زمانہ گیر ، شرر گوں ، جبلّتیں
کچھ تھا تو ایک برگِ دل ان کا لباس تھا

اس موڑ پر ابھی جسے دیکھا ہے ، کون تھا
سنبھلی ہوئی نگاہ تھی ، سادہ لباس تھا

یادوں کے دھندلے دیس ، کھلی چاندنی ہیں ، رات
تیرا سکوت کس کی صدا کا لباس تھا

ایسے بھی لوگ ہیں، جنہیں پرکھا تو ان کی روح
بے پیرہن تھی، جسم سراپا لباس تھا

صدیوں کے گھاٹ پر بھرے میلوں کی بھیڑ میں،
اے دردِ شادماں، ترا کیا کیا لباس تھا

دیکھا تو دل کے سامنے سایوں کے جشن میں
ہر عکسِ آرزو کا انوکھا لباس تھا

امجد، قبائے شہ تھی کہ چولا فقیر کا،
ہر بھیس میں ضمیر کا پردا لباس تھا

جب اک چراغِ راہگزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے

شاخِ ابد سے جھڑتے زمانوں کا روپ ہیں
یہ لوگ، جن کے رُخ پہ گمانِ چمن پڑے

یہ کس حسین دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی،
ہر موجۂ خیال پر صد ہا شکن پڑے

یہ کون ہے، لبوں میں رسیلی رتیں گھلی،
پلکوں کی اوٹ، نیندیں گل گوں گگن پڑے

اک پل بھی کوئے دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا میں چمن در چمن پڑے

اک جست اس طرف بھی غزالِ زمانہ رقص
رہ تیری دیکھتے ہیں خطا و ختن پڑے

جب انجمن توجّہِ صد گفتگو میں ہو
میری طرف بھی اک نگہِ کم سخن پڑے

صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

اے شاطرِ ازل ترے ہاتھوں کو چوم لوں
قرعے میں میرے نام جو دیوانہ پن پڑے

اے صبحِ دیر خیز، انہیں آواز دے جو ہیں
اک شامِ زود خواب کے سکھ میں مگن پڑے

امجدؔ طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دِل تو ہی بتا
کٹتی عُمر اور گھٹتے فاصلے پھر وہی صحرا

چیت آیا، چیتاوَنی بھیجی، اپنا وچن نبھا،
پت جھڑ آیا، پتر لکھے آ، جیون بیت چلا،

خوشیوں کا مُکھ چوم کے دیکھا، دُنیا مان بھَری
دُکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو رُوح کرے سجدا

اپنا پیکر، اپنا سایا، کالے کوس کٹھن
دُوری کی جب سنگت ٹُوٹی، کوئی قریب نہ تھا

شیشے کی دیوار زمانہ ، آمنے سامنے ہم
نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا

اپنے گرداب اپنے آپ میں کھلتی سوچ بھلی
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا

راہیں دھڑکیں ، شاخیں کڑکیں، اک اک ٹیس اٹل
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا ،

دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے ، کس کس کی سنیئے
بولی تو اک اک کی ویسی ، بانی سب کی جدا

میری مانند، خود نگر تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا

اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی
اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا

میرے نزدیک تیری دُوری تھی
کوئی منزل تھی، کوئی عالم تھا

ہائے وہ زندگی فریب آنکھیں
اس نے کیا سوچا، میں نے کیا سمجھا

صبح کی دھوپ ہے کہ رستوں پر
منجمد بجلیوں کا اک دریا

گھنگھروؤں کی جھنک منک میں بسی
تیری آہٹ ! میں کس خیال میں تھا

کون یاد آگیا تھا ، یاد نہیں
دل بھی اک ضرب بھول بھول گیا

سارے بندھن کڑے سہی لیکن
تجھ سے یہ ربط ، دھندلا اور گہرا

پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس
فاصلوں کی فصیل سے ابھرا

پھُول مرجھا نہ جائیں بجروں میں
مانجھیو، کوئی گیت ساحل کا

وقت کی سرحدیں سمٹ جائیں
تیری دُوری سے کچھ بعید نہ تھا

عمُر جلتی ہے، بخت جلووں کے
زیست مِٹتی ہے، بھاگ مٹی کا

رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس
پھُول لوہے کی باڑ پر بھی کھِلا

جو خود ان کے دلوں میں تھا تہِ سنگ
وہ خزانہ کسی کسی کو مِلا

لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی،
یہ محیط اک عجیب زاویہ تھا

سانس کی رَو میں رونما طوفان
تیغ کی دھار پر بہے دھارا

ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی
کھول کر بھی اسے کبھی دیکھا

روز جھکتا ہے کوئے دل کی طرف
کاخِ صد بام کا کوئی زینہ

امجد ان آنسوؤں کو آگ لگے
کتنا نرم اور گراں ہے یہ دریا

جو دل نے کہہ دی ہے وُہ بات اَن کہی بھی نہ تھی
یہ موج تو تہِ دریا کبھی رہی بھی نہ تھی

جھکیں جو سوچتی پلکیں، تو میری دُنیا کو
ڈبو گئی وُہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی

سرک گیا کوئی سایا، سمٹ گیا کوئی دور
کسی کے عکس کی پیاسی کشش سہی بھی نہ تھی

سُنی جو بات کوئی اَن سُنی تو یاد آیا،
وُہ دل کہ جس کی کہانی کبھی کہی بھی نہ تھی

نگر نگر وہی آنکھیں، پسِ زماں، پسِ در
مری خطا کی سزا عُمر گر بھی بھی نہ تھی

کِسی کی رُوح تک اِک فاصلہ خیال کا تھا
کبھی کبھی تو یہ دُوری رہی سہی بھی نہ تھی

نشے کی رو میں یہ جھلکا ہے کیوں نشے کا شعور
اس آگ میں تو کوئی آبِ آگہی بھی نہ تھی

غموں کی راکھ سے امجدؔ، وُہ غم طلوع ہوئے
جنہیں نصیب اِک آہِ سحر گہی بھی نہ تھی

جو ہو سکے تو مرے دل، اب اک وہ قصّہ بھی

ذرا سُنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی

کبھی سفر ہی سفر میں، جو عمرِ رفتہ کی سمت

پلٹ کے دیکھا تو اُڑتی تھی گردِ فردا بھی

مرے وجود میں رہیں جتنے موسم، ان کو بھی،

رُتوں کے رس رہیں بجھے سایو، تم نے دیکھا بھی

بڑے سلیقے سے دنیا نے میرے دل کو دیئے

وہ گھاؤ جن میں تھا سچائیوں کا حصّہ کا بھی

کسی کی روح سے تھا ربط، اپنے حصّے میں تھی

وہ بے کلی، جو ہے موجِ زماں کا حصّہ بھی

یہ آنکھیں، ہنستی وفائیں، یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی
یہ رسم، حاصلِ دنیا ہے، اِک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی
دلوں کی آنچ سے تھا برف کی سِلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہُوا پسینہ بھی
مجھے ڈھکی چھُپی ان بوجھی الجھنوں سے بلا ،
بچی تُلی ہوئی اک سانس کا بھروسہ بھی
کبھی کبھی انہی الھڑ ہواؤں میں، امجد
سُنا ہے دُور کے اک دیس کا سندیسہ بھی

اپنے دل کی چٹان سے پوچھو ریزہ اک پنکھڑی کا کتنا بوجھل ہے
اک آنسو کی بوندیں دیکھو، دنیا دنیا، عالم عالم جل تھل ہے

جس کو دیکھو اپنے سفر کی دنیا بھی ہے، اپنے سفر میں تنہا بھی
قدم قدم پر اپنے آپ کے سامنے ہے اور اپنے آپ سے اوجھل ہے

روح سے روح کا نازک بندھن، پھولوں کی زنجیریں جکڑی زندگیاں
کتنے دکھ ہیں کتنا چین ہے، کیسی دھوپ ہے، کتنا گہرا بادل ہے

آنکھ کی پتلی، سانس کی ڈوری، دل کی تھاپ، اک پل کی نرت کا تماشا ہے
گلتی کھوپڑیوں سے چُنی دیواروں پر اک جلتی جوت کی جھل جھل ہے

ایک زمانے سے یہی رستہ زیرِ قدم ہے، اک اک جھونکا محرم ہے

آج جو من کی اوٹ سے دیکھا، ہر سو اک ان دیکھی رت کی چھل بل ہے

بہتی روشنیاں، بیکار شعاعیں، بکھری ٹوٹی کرنیں، بے حرف سلیں،

اک دن انت یہی ہے، مگر وہ ایک کرن جو دل کے ورق پہ جدول ہے

جاوداں قدروں کی شمعیں بجھ گئیں تو جل اٹھی تقدیرِ دل،
اب تو اس مٹی کے ہر ذی روح ذرے میں بھی ہے تصویرِ دل،

اپنے دل کی راکھ چن کر، کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اک سیّال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل،

میں نہ سمجھا، ورنہ ہنگاموں کی دنیا میں اک آہٹ کے سنگ
کوئی تو تھا، آج جس کا قہقہہ دل میں ہے دامن گیرِ دل،

جاوداں قدروں کی گھتی اور الجھی، جل اٹھی تقدیرِ دل

رت[1] بدلتے ہی چمن جو ہم صفیر، اب کے بھی اتنی دُور سے
آ کے جب اس شاخ پر چہکے، مرے دل میں بجی زنجیرِ دل،

کیا سفر تھا، بے صدا صدیوں کے پل کے اس طرف اس موڑ تک
پے بہ پے اُبھرا، سنہری گرد سے اک نالۂ دلگیرِ دل

وار دُنیا نے کئے مجھ پر تو امجدؔ میں نے اس گھمسان میں
اپنا[2] سینہ چیر کر رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

لے ۔ رت بدلتے ہی چمن جو ہم صفیر اب بھی کوسوں دُور سے
تے ۔ کس طرح، جی ہار کر رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

کبھی تو سوچ ترے سامنے نہیں گزرے
وُہ سب سمے، جو ترے دھیان سے نہیں گزرے

یہ اور بات کہ ہوں ان کے درمیان میں بھی،
یہ واقعے کسی تقریب سے نہیں گزرے

اِن آئینوں میں جلے ہیں ہزار عکس عدم
دوامِ درد! ترے رتجگے نہیں گزرے

سپردگی میں بھی اک رمزِ خود نگہداری
وُہ میرے دل سے مرے واسطے نہیں گزرے

بکھرتی لہروں کے ساتھ ان دنوں کے تنکے بھی تھے
جو دل میں بہتے ہوئے رک گئے نہیں گزرے

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر، امجدؔ،
جو اپنی رُوح کی منجدھار سے نہیں گزرے

عمروں کے اس معمورے میں، ہے کوئی ایسا دن بھی، جو
رُوح میں اُبھرے، چاند کے سورج کے سیّال سمندر کو

کتنے کام ہیں، ان موّاج صفوں میں خوش پھرتا ہوں
لیکن آج اگر کچھ اپنے بارے میں بھی سوچا، تو

ایک سفر ہے صرف مسافت ایک سفر ہے جزوِ سفر
جینے والے یوں بھی جیتے ہیں، اِک عمر اور زمانے، دو

یہ اَن جانا شہر، پرائے لوگ، اے دل، تم یہاں کہاں
آج اِس بھیڑ میں اتنے دنوں کے بعد ملے ہو، کیسے ہو

دُنیا جڑی تڑی سچائی، سب سچے، کوئی تو کبھی

اس اندھیرے سے نکلے اپنے چھوٹے روپ کے درشن کو

آخر اپنے ساتھ کبھی تو اِک بے مہر مروت بھی

اپنے سارے نام بھلا کر، کبھی خود اپنے گن تو گنو

کچی نیند اور جسم نے دھوپ چکھی اور دل میں پھول کھلے

گھاس کی سیج پہ میں ہوں تمہارے دھیان میں آنے والے دنو!

جو دن کبھی نہیں بیتا، وہ دن کب آئے گا
انہی دنوں میں اس اک دن کو کون دیکھے گا

اس ایک دن کو جو سورج کی راکھ میں غلطاں
انہی دنوں کی تہوں میں ہے کون دیکھے گا،

اس ایک دن کو جو ہے عمر کے زوال کا دن
انہی دنوں میں نمویاب، کون دیکھے گا،

یہ ایک سانس جھمیلوں بھری جگوں میں رچی
اس اپنی سانس میں انت اپنا کون دیکھے گا

اس اپنی مٹی میں، جو کچھ امٹ ہے، مٹی ہے
جو دن ان آنکھوں نے دیکھا ہے، کون دیکھے گا

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا

دو رویہ ساحلِ دیوار، اور پسِ دیوار
اک آئینوں کا سمندر ہے، کون دیکھے گا

ہزار چہرے خود آرا ہیں کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا

ترخ کے گرد کی تہ سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی، کوئی تو دیکھے گا، کون دیکھے گا

سفر کی موج میں تھے، وقت کے غبار میں تھے
وہ لوگ جو ابھی اس قریۂ بہار میں تھے،

وہ ایک چہرے پہ بکھرے عجب عجب سے خیال
میں سوچتا تو وہ غم میرے اختیار میں تھے

وہ ہونٹ جن میں تھا میٹھی سی ایک پیاس کا رس
میں جانتا تو وہ دریا مرے کنار میں تھے

مجھے خبر بھی نہ تھی اور اتفاق سے، کل
میں اُس طرف سے جو گزرا وہ انتظار میں تھے

میں کچھ سمجھ نہ سکا میری زندگی کے وہ خواب
ان انکھڑیوں میں جو تیرے تھے کس شمار میں تھے

میں دیکھتا تھا وُہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ابھی یہیں تھے ، ابھی گردِ رہ گزار میں تھے

میں دیکھتا تھا ، اچانک یہ آسماں یہ کرے
بس ایک پل کو رکے اور پھر مدار میں تھے

ہزار بھیس میں سیّار موسموں کے سفیر
تمام عمر مری روح کے دیار میں تھے

اَن گنت امروں میں اور کیا ہے، ترے دل کے لئے
ایک جیون ہار ڈر سا ہے، ترے دل کے لئے

رک کے اس دھارے میں کچھ سوچ اک یہ اَچھا سا خیال
جو ترے حق میں ہے، کیسا ہے، ترے دل کے لئے

اپنے جی میں جی، مگر اُس یاد سے غافل نہ جی
جو کسی کے دل میں زندہ ہے، ترے دل کے لئے

سب ضمیروں کے ثمر ہیں، پستیاں، سچائیاں
جانے تیرے ذہن میں کیا ہے، ترے دل کے لئے

والہانہ رابطوں میں جب کے پہلو بھی دیکھنا

جو بھی دل ہے ایک پنجرا ہے ، ترے دل کے لئے

تو کہ اپنے ساتھ ہے اپنے بدن کے واسطے

کوئی تیرے ساتھ تنہا ہے ، ترے دل کے لئے

تیری پلکیں جھک گئیں امجد دیئے جب یوں جلے

جانے کس کا ذکر چمکا ہے ، ترے دل کے لئے

اک سانس کی مدھم لو تو یہی، اک پل تو یہی، اک چھن تو یہی

تج دو کہ برت لو دل تو یہی، چن لو کہ گنوا دو دن تو یہی

لرزاں ہے لہو کی خلیجوں میں، پیچاں ہے بدن کی نسیجوں میں

اک بجھتے ہوئے شعلے کا سفر، کچھ دن ہے اگر کچھ دن تو یہی

میں ذہن پہ اپنے گہری شکن، میں صدق میں اپنے بھٹکا ہوا

ان بندھنوں میں اک انگڑائی، منزل ہے جو کوئی کٹھن تو یہی

اس ڈھب سے جئیں، سینوں کے شرر جھونکوں میں گھلیں، قدروں میں تپیں

کاوش ہے کوئی مشکل تو یہی، کوشش ہے کوئی ممکن تو یہی

پھر برف گری، اک گزری ہوئی رت جھڑ کی بہاریں یاد آئیں

اس رت کی نکہت ہواؤں میں ہیں، کچھ ٹیسیں اتنی دکھن تو یہی

اک اچھائی ہیں سب کا یا دنیا کی
اس برتاؤ میں ہے سب برتا دنیا کی،

پھول تو سب اک جیسے ہیں سب مٹی کے
رت کوئی بھی ہو دل کی یا دنیا کی

اس اک باڑ کے اندر سب کچھ اپنا ہے
باہر دنیا، کس کو پروا دنیا کی

ان چمکیلے زینوں میں یہ خوش خوش لوگ
چہروں پر تسکین، دنیا دنیا کی

اُجلی کینچلیوں میں صاف تھرکتی ہے
ساری کوڑھ کلنکی مایا دنیا کی

پھر جب وقت بجھا تو ان پلکوں کے تلے
بہتے بہتے تھم گئی ندیا دُنیا کی

جم گئے، خود ہی اس دلدل میں اور خود ہی
کریں شکایت ، اہل دنیا دنیا کی

دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا کام
پہروں بیٹھے باتیں کرنا دنیا کی

دلوں پہ ظالم یکساں سچ کا پہرا ہے
کوئی تو جھوٹی ریت نبھا جا دنیا کی

پھر تو سب ہمدرد، بہت افسوس کے ساتھ یہ کہتے تھے،

خود ہی لڑے بھنور سے کیوں زحمت کی، ہم جو بیٹھے تھے

دل کے علموں سے وہ اُجالا تھا، ہر جیہد کالا تھا،

یوں تو کسی نے اپنے بھید کسی کو نہیں بتائے تھے

ماتھے جب سجدوں سے اُٹھے تو صفوں صفوں جو فرشتے تھے

سب اس شہر کے تھے، اور ہم ان سب کے جاننے والے تھے

اہلِ حضور کی بات نہ پوچھو، کبھی کبھی ان کے دن بھی،

سوز صفا کی اک صفرادی اکتاہٹ میں کٹتے تھے

قالینوں پر بیٹھ کے عظمت والے سوگ میں جب روئے

دیمک والے ضمیر اس عزتِ غم پر کیا اترائے تھے،

جن کی جبیں کے کنڈل میں تھا نیشِ عقرب کا پیوند

لکھا ہے، ان بدسخنوں کی قوم پہ اژدر برسے تھے

جن کے لہو سے نکھر رہی ہیں یہ سرسبز ہمیشگیاں،

ازلوں سے وُہ صادق جذبوں طیب رزقوں والے تھے

اور اَب یہ کہتا ہوں، یہ جُرم تو روا رکھتا
میں عُمر اپنے لئے بھی تو کُچھ بچا رکھتا
خیال صبحوں، کرن ساحلوں کی اوٹ، سدا،
میں موتیوں جڑی بنسی کی لے جگا رکھتا
جب آسمان پہ خُداؤں کے لفظ ٹکراتے
میں اپنی سوچ کی بے حرف لو جلا رکھتا
ہوا کے سایوں میں، ہجر اور ہجرتوں کے وہ خواب
میں اپنے دل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا
انہی حدوں تک ابھرتی، یہ لہر جس میں ہوں میں
اگر میں سب یہ سمندر بھی وقت کا رکھتا

پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے

نشیب زینۂ ایّام پر عصا رکھتا

یہ کون ہے جو مری زندگی میں آ کر،

ہے مجھ میں کھوئے مرے جی کو ڈھونڈتا رکھتا

غموں کے سبز تبسم سے کنج مہکے ہیں،

سمے کے سم کے ثمر ہیں، ہیں اور کیا رکھتا

کسی خیال میں ہوں یا کسی خلا میں ہوں

کہاں ہوں کوئی جہاں تو۔ مرا پتا رکھتا

جو شکوہ اب ہے یہی ابتدا میں تھا امجدؔ

کریم تھا، مری کوشش میں انتہا رکھتا

بچا کے رکھا ہے جس کو غروبِ جاں کے لیے
یہ ایک صبح تو ہے، سیر بوستاں کے لیئے
چلیں کہیں تو سیہ دل زمانوں میں ہوں گی
فراغتیں بھی، اس اک صدقِ رائیگاں کے لیئے
لکھے ہیں لوحوں پر جو مردہ لفظ ان میں جیئں
اس اپنی زیست کے اسرار کے بیاں کے لیئے
پکارتی رہی بنسی، بھٹک گئے ریوڑ
نئے گیاہ، نئے چشمۂ رواں کے لیئے
سحر کو نکلا ہوں، مینہ میں، اکیلا کس کیلئے
درخت، ابر، ہوا، بوٹے ہمرہاں کے لیئے

سوادِ نُور سے دیکھیں تو تب سراغ ملے

کہ کس مقام کی ظلمت ہے کس جہاں کے لیئے

تو روشنی کے ملیدے ہیں ، رزق کی خاطر

ہیں روشنائی کے گودڑے ہیں آب و ناں کے لئے

ترس رہے ہیں سدا خشت لمحوں کے دیس

جو میرے دل میں ہے اُس شہرِ بے مکاں کے لئے

یہ نین ۔ جلتی لووں جیتی سیکیوں والے

گھنے بہشتوں کا سایہ ہیں ارضِ جاں کے لئے

ضمیرِ خاک میں خفتہ ہے میرا دل ، امجد

کہ نیند مجھکو ملی خوابِ رفتگاں کے لئے ،

بنے یہ زہر ہی وجہِ شفا جو تو چاہے
خرید لوں میں یہ نقلی دوا جو تو چاہے

یہ زرد پنکھڑیاں جن پر کہ حرف حرفِ گُلِ تر
ہوائے شام میں مہکیں ذرا جو تو چاہے

تجھے تو علم ہے کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا، تو کیا، جو تو چاہے

جب ایک سانس گھسے ساتھ ایک نوٹ پسے
نظامِ زر کی حسیں آسیا، جو تو چاہے

جہاں میں تیری شکم سیر روح ہے آزاد
اب اے اسیرِ کمندِ ہوا، جو تو چاہے

ذرا شکوہِ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اس کے بعد ترا فیصلہ جو تو چاہے

سلام اُن پہ تہِ تیغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں امجدؔ
کھلیں وہ پھول بھی، اک مرتبہ جو تو چاہے

ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیئے
صحت کا ایک پہلو مریضانہ چاہیئے

دنیائے بے طریق میں جس سمت بھی چلو
رستے میں اک سلام رفیقانہ چاہیئے

آنکھوں میں اُڑتے رُوح کی نزدیکیوں کے ساتھ
ایسا بھی ایک دور کا یارانہ چاہیئے

کیا پستیوں کی ذلّتیں کیا عظمتوں کے فیض
اپنے لیئے عذاب جداگانہ چاہیئے

اب دردِ شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو، اب تو نیند کو آجانا چاہیئے

روشن ترائیوں سے اترتی ہوائیں آج
دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیئے

امجد، ان اشک بار زمانوں کے واسطے
اک ساعتِ بہار کا نذرانہ چاہیئے

صبحوں کی وادیوں میں گُلوں کے پڑاؤ تھے
دُور، ایک بانسری پہ یہ دھن "پھر کب آؤ گے"

اک بات رہ گئی کہ جو دل میں، نہ لب پہ تھی
اُس اک سخن کے وقت کے سینے پہ گھاؤ تھے

کِھلتی کلی کِھلی، کسی تاکید سے نہیں
ان سے وہ ربط ہے جو الگ ہے لگاؤ سے

عیب اپنی خوبیوں کے چُنے، اپنے غیب میں
جب کھنکھنائے قہقہوں میں من گھناؤنے

کاغذ کے پانیوں سے جو ابھرے تو دُور تک
پتھر کی ایک لہر پہ ، تختے تھے ناؤ کے ،

کیا رو تھی ، جو نشیبِ افق سے مری طرف
تیَری پلٹ پلٹ کے ندی کے بہاؤ کے

امجد ، جہاں بھی ہوں ہیں سب اس کے دیار ہیں
کُنجیں سہاؤنے ہوں کہ جنگل ڈراؤنے

چمن تو ہیں نئی صبحوں کے دائمی ، پھر بھی
ہے میرے ساتھ ، لواب ختمِ قرآن آخر بھی

مری ہی عمر تھی جو میں نے رائیگاں بھی
کسی کے پاس نہ تھا ایک سانس وافر بھی

خود اپنے غیب میں بن باس بھی ملا مجھکو
میں اس جہان کے ہر سانحے میں حاضر بھی

ہیں یہ کھچاؤ جو چہروں پہ آپ نے ناں کے لئے
انہی کا حصّہ ہے میرا سکونِ خاطر بھی

میں اس جواز میں نادم بھی اپنے صدق پہ ہوں
میں اس گنہ میں ہوں اپنی خطا سے منکر بھی

یہ کس کے اذن سے ہیں، اور یہ کیا زمانے ہیں،
جو زندگی میں مرے ساتھ ہیں مسافر بھی

میں تیری گھات میں امجدؔ جو آسمانوں کے ذہن
ذرا بہ پاسِ وفا ان کے دام میں گر بھی

یہ دن، یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن
کہ جس کے ساتھ ہوئے ختم لاکھ دورِ زماں،

ابھی ابھی وہ یہیں تھا، زمانہ سوچے گا،
انہیں گلوں میں ہیں اس کے تبسموں کے نشاں

ہمیں نے دیکھا ہے اسکو ہمیں خبر ہے وہ شخص،
دلوں کی روشنیاں تھا، دلوں کی زندگیاں

اور اب جو تو نہیں، کچھ بھی نہیں، نہ ہم نہ حیات
ہر ایک سمت اندھیرا، ہر ایک سمت خزاں

ترے لئے جھکے مینائے کوثر و تسنیم
ترے لئے کھلیں درہائے روضۂ رضواں

نئی صبحوں کی سیر کا یہ خیال

اپنے طغیان کی سزا یہ خیال

میّتوں کو لحد میں کلپاتے

ہو سکے سجدہ اک ادا، یہ خیال

سب کی روحیں تھیں ریت کے پر بط

اک مری زیست میں جیا یہ خیال

اتنے رنگوں میں یہ گلاب کے پھول

اتنے رنگوں میں موت کا یہ خیال،

ابر ہیں امجد اور یہ جنت برگ

دیکھ سمتوں کو ربط کا یہ خیال،

مجید امجد کی آخری غزل جو انہوں نے وفات سے کچھ دن پیشتر کہی اور جس پر انہیں نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔